فکر و نظر--- اسلام آباد جلد:۴۰-۴۱ شمارہ:۴، ۱

اسلامی قانون بین الاقوام کی تشکیلِ جدید میں ڈاکٹر محمد حمیداللہؒ کا کردار

ڈاکٹر محمد طاہر منصوری ☆

بیسویں صدی میں مغربی مصنفین اور مستشرقین کی طرف سے اسلام پر جو مختلف اعتراضات کئے گئے ہیں ان میں ایک یہ ہے کہ اسلام میں پُرامن بقائے باہمی (Peaceful Co-existence) کا کوئی تصور موجود نہیں۔ اسلام میں تعلقات کی بنیاد جنگ ہے اور امن و صلح ایک عارضی چیز ہے۔ ان مستشرقین نے اپنے دعویٰ کو ثابت کرنے کے لیے فقہ اسلامی سے ایسا مواد پیش کیا ہے جس سے یہ مفہوم اخذ کیا جا سکے کہ اسلامی ریاست اپنے مزاج میں ایک توسیع پسند ریاست ہے، وہ دوسری ریاستوں کے ساتھ ہر وقت برسرپیکار اور آمادہ جنگ رہتی ہے۔ وہ ان ریاستوں کی علاقائی سالمیت، آزادی و خود مختاری اور علاقائی اقتدار اعلیٰ کو تسلیم نہیں کرتی۔ وہ دنیا میں اقتدار اعلیٰ رکھنے والی ریاستوں کے نظاموں اور قوانین کو بھی رد کرتی ہے۔ اسلامی بین الاقوامی قانون کے ایک ممتاز مستشرق عالم پروفیسر مجید خدوری لکھتے ہیں:

> ''اسلام کے نظریۂ قانون کے مطابق جہاد اہل ایمان کا ایک دائمی فریضہ ہے۔ اگر باضابطہ مسلح جنگ نہ بھی ہو، تب بھی نفسیاتی اور سیاسی سطح پر جنگ کے ایک مسلسل عمل کی صورت میں اس فریضے کو انجام دینا مطلوب ہے، یہاں تک کہ دارالاسلام کو دارالحرب پر غلبہ ہو جائے۔ اسلامی قانون مذکورہ بالا فریقین کے درمیان مختصر عرصہ ہائے امن کی اجازت دیتا ہے جو کسی باہمی معاہدے کے ذریعے طے کئے جائیں اور جن کی میعاد دس سال کے عرصے سے زائد نہ ہو''(۱)۔

پروفیسر مجید خدوری کے خیال میں اسلام غیر جانبداری کا قائل نہیں۔ وہ دنیا کو دارالاسلام اور دارالحرب کے دو متحارب بلاکوں میں تقسیم کرتا ہے، ان کے درمیان کسی تیسرے بلاک کے وجود کو وہ تسلیم نہیں کرتا۔ پروفیسر خدوری کی نگاہ میں اسلامی ریاست کے دوسری ریاستوں کے ''حق بقا'' کو تسلیم نہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اسلام کی نظر میں دارالحرب کے کفار اس مطلوبہ شرعی و اخلاقی اہلیت سے

☆ ایسوسی ایٹ پروفیسر، ادارہ تحقیقات اسلامی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

عاری ہیں جس کی بنیاد پر ان کے ساتھ برابری کا معاملہ کیا جائے(۲)۔

ایک اور مشہور مستشرق برنارڈلویس نے بھی اسی طرح کے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ یہ مصنف لکھتا ہے:

''اسلام میں فریضۂ جہاد کا بنیادی محرک اسلام کے پیغام اور اس کی دعوت کی عالمگیریت ہے۔ اس کے مخاطب دنیا کے ہر خطے کے انسان ہیں۔ اس آفاقی دعوت کا تقاضا ہے کہ ہر وہ شخص جو اس دین کا پیروکار ہے وہ اس کے نہ ماننے والوں کے ساتھ مسلسل برسرپیکار رہے۔ یہاں تک کہ وہ اسلام پر ایمان لے آئیں یا اسلامی غلبے کے سامنے ہتھیار ڈال دیں۔ اس حالت جنگ میں عارضی وقفہ امن بھی آ سکتا ہے تاہم ضروری ہے کہ ایسے وقفے بہت مختصر ہوں۔ یہ حالت جنگ اسلام کی کفر پر فتح اور غلبہ کے ساتھ ہی ختم ہوسکتی ہے''(۳)۔

برنارڈلویس کے علاوہ بیسویں صدی کے کئی اور اہل قلم نے بھی اسلام کو ایک استعماری نظام کے طور پر پیش کیا ہے(۴)۔

عالم اسلام کے جن ممتاز علماء اور اہل قلم نے مستشرقین کے ان الزامات اور غلط فہمیوں کو اپنے مطالعے کا موضوع بنایا، ان میں سب سے نمایاں نام ڈاکٹر محمد حمیداللہ مرحوم کا ہے۔ ڈاکٹر محمد حمیداللہؒ نے اسلامی بین الاقوامی قانون پر اپنی معرکۃ الآراء تحریروں میں نہ صرف یہ کہ مستشرقین کی پیداکردہ غلط فہمیوں کا ازالہ کیا، بلکہ اسلامی بین الاقوامی قانون کی ایک نئے انداز میں تشکیل و تدوین کی۔ انہوں نے جدید قانون بین الاقوام کے اہم موضوعات پر اسلامی نقطہ نظر سے بحث و تحقیق کی۔ اس مطالعے میں انہوں نے ان مفاہیم و تصورات کی نشاندہی کی جو ان کی نگاہ میں اسلامی تعلیمات سے متعارض و متصادم ہیں۔

بین الاقوامی قانون ان کی خصوصی دلچسپی کا موضوع تھا۔ اُن کی کتاب ''قانون بین الممالک کے اصول اور نظیریں'' غالباً اردو میں اس موضوع پر قدیم ترین تحریر ہے۔ اسلام کے بین الاقوامی قانون پر ان کی رجحان ساز تحریریں مشرق و مغرب میں علم و تحقیق کا لوہا منوا چکی ہیں۔ اسلامی بین الاقوامی قانون پر ان کی سب سے پہلی تحریر ''اسلامی بین الاقوامی قانون میں ''تصور غیر جانبداری'' ہے۔ یہ ان کا پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے جسے ۱۹۳۳ء میں جرمنی کی بون یونیورسٹی میں آپ نے پیش کیا تھا۔ یہ اپنی نوعیت کا ایک منفرد کام ہے۔ بین الاقوامی تعلقات میں غیر جانبداری کے اسلامی تصور پر یہ پہلی تحریر

ہے جس میں ایک مدلل علمی انداز میں اسلام میں غیر جانبداری کے مفہوم اور اس کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے۔ اسلام کے بین الاقوامی قانون پر ان کی ایک معرکۃ الآراء تصنیف ''مسلم کنڈکٹ آف اسٹیٹ'' ہے۔ اس کتاب میں ڈاکٹر محمد حمیداللہ نے بین الاقوامی قانون پر اوپن ہائم کی مشہور کتاب ''انٹرنیشنل لاء'' کے انداز کی پیروی کی ہے۔ اوپن ہائم نے جن موضوعات و مباحث پر گفتگو کی ہے، انہیں ڈاکٹر محمد حمیداللہ نے اس کتاب میں اپنے مطالعے کے لئے منتخب کیا۔ ''مسلم کنڈکٹ آف سٹیٹ'' میں انہوں نے اسلامی قانون بین الاقوام کے مآخذ، قانون بین الاقوام کے ارتقاء میں مسلمانوں کا حصہ، دوران امن بین الاقوامی تعلقات، ریاستی اقتدار اعلیٰ اور حدود اختیار، سفارت کاری، معاہدات، جنگ کے دوران تعلقات، جنگ کی اقسام، جنگی قیدیوں کے ساتھ برتاؤ، اور تصور غیر جانبداری جیسے موضوعات پر گفتگو کی ہے اور ان امور پر قرآن و سنت، سیرت پاک ﷺ، سیرت صحابہؓ، اسلامی تاریخ اور فقہ اسلامی کی روشنی میں شرعی نقطہ نظر بیان کیا ہے۔ ساتھ ہی ان موضوعات پر جدید بین الاقوامی قانون کا موقف بھی واضح کیا ہے۔ اس طرح انہوں نے اسلامی بین الاقوامی قانون کی ایک نئے انداز میں تشکیل و تدوین کی ہے۔

ذیل میں ہم اس بات کا جائزہ لیں گے کہ اسلامی قانون بین الاقوام کے ارتقاء اور اس کی تشکیل نو میں ڈاکٹر محمد حمیداللہ کا حقیقی کردار کیا ہے؟ فقہ اسلامی کے اس شعبے میں ان کا کام اپنے معاصر مفکرین سے کس طرح منفرد اور ممیّز ہے؟ قدیم نظریۂ سیر پر ڈاکٹر محمد حمیداللہ نے کیا اضافے کئے ہیں؟ ان سوالوں کا جواب ''مسلم کنڈکٹ آف سٹیٹ'' اور قانون بین الاقوام پر ان کی دیگر تحریروں میں اٹھائے گئے مباحث کی روشنی میں دیا جائے گا۔

ا۔ اسلامی قانون بین الاقوام کا امتیاز

مغربی اہل قلم اور دانشور یہ بات بہت زور دے کر کہتے ہیں کہ جدید بین الاقوامی قانون مغربی مفکرین کی کاوشوں کا مرہون منت ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ جدید بین الاقوامی قانون کی داغ بیل سترہویں صدی کے ایک مفکر گروشش (۱۶۴۵-۱۵۸۳) نے ڈالی۔ وہ یونانی اور رومی عہد میں بھی بین الاقوامی تعلقات کو منضبط کرنے والے قواعد و ضوابط تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ڈاکٹر محمد حمیداللہ نے مغرب کے اس دعوے کو رد کیا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ بین الاقوامی قانون اپنی عالمگیر اور آفاقی صورت میں صرف مسلمانوں کا رہین منت ہے۔ اس نوع کا قانون بین الممالک سب سے پہلے مسلمانوں نے ہی ایجاد کیا[۵]۔ یہ قانون بلا تفریق ملت، رنگ ونسل تمام اقوام کے لئے یکساں ہے۔

یہ شریعت کا حصہ ہے اور ہر اسلامی مملکت اور ہر مسلم حکمران کے لئے واجب الاتباع ہے۔

ڈاکٹر محمد حمیداللہ کہتے ہیں کہ مسلمانوں سے پہلے یونانی، رومی اور مسیحی عہد میں موجود بین الاقوامی قانون یا تعلقات کے قواعد اپنے اطلاق میں جہاں محدود تھے وہاں وہ دوسری اقوام کے حوالے سے امتیازی بھی تھے۔ یونانی قواعد صرف جزیرہ نمائے یونان میں بسنے والی ہم مذہب، ہم زبان اور ہم تمدن قوموں اور شہری مملکتوں کے لیے تھے۔ باقی دنیا کے لیے جسے غیر مہذب قرار دیا گیا تھا، یہ قواعد نہیں تھے۔

یونان کا سب سے بڑا فلسفی ارسطو غیر یونانیوں کے بارے میں یہ فیصلہ دیتا ہے کہ ''فطرت نے انہیں یونانیوں کا غلام بننے کے لیے پیدا کیا ہے اور ان کے متعلق یونانی اپنی صوابدید پر جو چاہے عمل کر سکتا ہے''(۶)۔

یونان کی طرح رومی سلطنت کے قواعد بین الاقوامی تعلقات بھی امتیازی تھے۔ رومیوں نے اس غرض سے دنیا کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ ایک رومی اور دوسری غیر رومی۔ دونوں کے لیے الگ الگ اصول و قواعد تھے۔ رومی غیر رومیوں کو غیر مہذب اور اپنے سے کمتر سمجھتے تھے اور ان کے ساتھ برتاؤ بھی دوسرے درجے کے انسان کے طور پر کرتے تھے۔ اس بناء پر رومی قواعد بین الاقوامی تعلقات کو بھی عالمگیر انسانی بین الاقوامی اصول قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یورپ اور امریکہ میں ۱۸۵۶ء تک بین الاقوامی تعلقات سے متعلق اصول بڑی حد تک صرف مسیحی مملکتوں کے باہمی تعلقات منضبط کرنے کے لیے تھے۔ ان قواعد میں کسی غیر عیسائی کے لیے کوئی حق تسلیم نہیں کیا گیا تھا۔ ترکی نے جب مشرقی یورپ کی عیسائی سلطنتوں کو فتح کیا تو اہل یورپ نے مجبوراً پہلی دفعہ ۱۹۵۶ء کے ایک معاہدے کے تحت سلطنت عثمانیہ کو یہ حق دیا کہ وہ مسیحی بین الاقوامی قانون کے تحت حقوق و مراعات کا مطالبہ کر سکتی ہے۔ ان حقائق سے یہ نتیجہ بآسانی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ قرون وسطیٰ کے عیسائی قانون بین الاقوام میں خود مختار قوموں کی آزادی، اقتدارِ اعلیٰ اور مساوات کے اس تصور کی کوئی گنجائش نہیں تھی جو آج کے بین الاقوامی قانون کی بنیاد ہے۔

مذکورہ قواعد بین الاقوامی تعلقات کے برعکس اسلام کا بین الاقوامی قانون اپنی وسعت و اطلاق میں آفاقی اور ہمہ گیر ہے۔ وہ تمام انسانوں اور اقوام کے لیے ہے۔ اس میں مذہب، علاقہ، رنگ، نسل، زبان وغیرہ کی بنیاد پر کسی قوم کے ساتھ کوئی امتیاز روا نہیں(۷)۔ یہ قانون تمام اقوام کے لیے یکساں ہے۔ حاکم کی صوابدید یا اصول شکنی کی ان میں کوئی گنجائش نہیں۔ اسلام کا قانون بین الاقوام

اسلامی شریعت کا ایک جزو لاینفک ہے۔ اس کی پابندی ایک مسلمان کے عقیدے اور ایمان کا حصہ ہے۔ جس طرح عبادات، نکاح و طلاق، معاملات سے متعلق شریعت کے اوامر و نواہی واجب الاتباع ہیں اسی طرح بین الاقوامی تعلقات سے متعلق شریعت کے قواعد بھی ایک لازمی اور واجب الاتباع قانون کی حیثیت رکھتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں مسلمانوں کے لیے جس طرح نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کی ادائیگی واجب ہے، اسی طرح غیر مسلم اقوام کے ساتھ معاہدات کی پابندی بھی واجب ہے۔ اس میں یونانی، رومی و مسیحی قانون کے برعکس حاکم کی صوابدید کا کوئی عمل دخل نہیں۔ اس حیثیت سے اسلام میں ملکی قانون اور بین الاقوامی قانون کے درمیان کوئی فرق نہیں۔

اس طرح اسلامی بین الاقوامی قانون میں قوت نافذہ (Sanction) کا وہ مسئلہ بھی حل ہو جاتا ہے جو بین الاقوامی قانون کے مفکرین کے سامنے اوّل روز سے ہی ایک پیچیدہ اور لاینحل مسئلے کے طور پر رہا ہے۔ اور جسکی بناء پر وہ یہ کہنے پر مجبور ہوئے ہیں کہ بین الاقوامی قانون صحیح معنوں میں قانون نہیں۔ اس ضمن میں ان مفکرین کا استدلال یہ ہے کہ قانون بین الاقوام پر عمل درآمد کرانے کے لیے کوئی مقتدر طاقت نہیں جو اس کی خلاف ورزی کرنے والوں کو سزا دے۔ نیز کوئی ایسی بااختیار مقنّنہ نہیں جو بین الاقوامی تعلقات کے قواعد وضع کر کے آزاد ریاستوں سے ان پر عمل درآمد کرائے(۸)۔

ڈاکٹر محمد حمیداللہ نے اسلام کے نظریہ بین الاقوامی تعلقات کا یونانی، رومی اور مسیحی قواعد بین الاقوامی تعلقات کے ساتھ تقابل کر کے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اسلامی بین الاقوامی قانون اپنے اطلاق میں آفاقی اور عالمگیر ہے۔ اس کا مقصد غیر مسلم قوموں کے ساتھ عدل و انصاف پر مبنی تعلقات استوار کرنا ہے۔ یہ قانون اپنے پیچھے ایک مضبوط و مؤثر قوت نافذہ رکھتا ہے۔ اس کی قوت نافذہ جہاں ریاست کی قوت قاہرہ اور اس کا قانونی نظام ہے وہاں فکرِ آخرت اور خدا کے سامنے جوابدہی جیسے مفاہیم بھی ہیں(۹)۔ ان اقدار و مفاہیم کی بناء پر ایک فرد ذمیوں کے حقوق اور غیر مسلموں کے ساتھ معاہدات کی پاسداری جیسے امور کو بھی اپنے دین و ایمان کا حصہ سمجھتا ہے۔

ڈاکٹر محمد حمیداللہ کی رائے میں اسلام کا قانون بین الاقوام انسانی معاشرے کی بین الاقوامی تشکیل میں ایک موثر کردار کر سکتا ہے کیونکہ وہ انسان کو رنگ و نسل، علاقہ و قوم اور زبان و معاشرت کی قید سے نکال کر ایک عالمگیر انسانی معاشرے کا حصہ بناتا ہے(۱۰)۔

۲۔ ریاستوں کی آزادی اور اقتدار اعلیٰ کا احترام

جدید بین الاقوامی قانون تمام ریاستوں کی آزادی اور اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کرتا ہے۔ ریاستی آزادی اور اقتدار اعلیٰ کے مفہوم میں یہ باتیں شامل ہیں:-

۱۔ ریاست کو اپنی حدود میں تمام افراد، اشیاء، اداروں اور اس کے علاقے میں ہونے والے تمام معاملات و مسائل پر مکمل اقتدار اعلیٰ ہو۔

۲۔ وہ بین الاقوامی امور میں خود مختار ہو۔ وہ دیگر ریاستوں کے تعلقات قائم کرنے میں آزاد ہو۔

۳۔ وہ اپنے معاملات میں بیرونی مداخلت سے محفوظ ہو۔

۴۔ اسے دیگر ریاستوں کے مساوی حیثیت حاصل ہو۔ بین الاقوامی قانون اس کی اس مساوی حیثیت کا احترام کرتا ہو[۱۱]۔

مذکورہ ریاستی آزادی اور اقتدارِ اعلیٰ کا منطقی تقاضا ہے کہ ہر ریاست کا حق بقا تسلیم کیا جائے اور اس کی آزادی و خودمختاری کا احترام کیا جائے۔

جدید بین الاقوامی قانون کی طرح اسلام کا قانون بین الاقوام بھی ریاستوں کی آزادی، خود مختاری، اقتداراعلیٰ، ان کی مساوی حیثیت اور ان کے حق بقا کو تسلیم کرتا ہے۔ ڈاکٹر محمد حمیداللہ کے خیال میں گو کہ اسلام کا پیغام عالمی و آفاقی ہے جس کا تقاضا پوری دنیا میں اللہ کے دین کا غلبہ اور اس کے نظام کا قیام ہے تاہم اس کا مطلب غیر مسلم ریاستوں کے حق بقاء کی نفی نہیں ہے۔ اسلام مسلمانوں کو ایسی تمام اقوام کے ساتھ امن پر مبنی تعلقات کی ہدایت کرتا ہے، جو مسلمانوں کے ساتھ جنگ سے احتراز کریں اور صلح و امن کے ساتھ رہنا چاہیں۔ وہ ایسی اقوام کے ساتھ امن کے معاہدات کی نہ صرف اجازت دیتا ہے بلکہ ان کی پابندی کو ایک دینی فریضہ قرار دیتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں اسلام کے نظریہ سیر میں ریاستوں کے پرامن بقائے باہمی کا وہ اصول تسلیم کیا گیا ہے، جو آج کے بین الاقوامی تعلقات کی بنیاد ہے۔ پرامن بقائے باہمی کے اس تصور کے حق میں ڈاکٹر محمد حمیداللہ درج ذیل حقائق سے استدلال کرتے ہیں[۱۲]:

۱۔ قرآن ایسی ریاستوں اور اقوام کے ساتھ امن کی ہدایت کرتا ہے جو مسلمانوں کے ساتھ معاندانہ رویہ روا نہ رکھیں[۱۳]۔

۲۔ قرآن غیر مسلم اقوام کے ساتھ معاہدات کی پابندی کو دینی فریضہ قرار دیتا ہے[۱۴]۔

۳۔ قرآن میں یہ بات بہت زور دے کر کہی گئی ہے، یہ زمین اللہ کی ہے، اس پر وہ جسے چاہتا ہے، اقتدار بخشتا ہے[۱۵]۔ یہ گویا ریاستوں کے اقتدار اعلیٰ کا اقرار و اعتراف ہے۔

ڈاکٹر محمد حمیداللہ کے پیش کردہ اس تصور پرامن بقائے باہمی نے جدید نظریہ سیر پر گہرے اثرات ڈالے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے بعد آنے والے اسلامی بین الاقوامی قانون کے بیشتر مفکرین نے اس فکر کو آگے بڑھایا ہے، اور اس کے مختلف گوشوں کو اُجاگر کیا ہے۔

ڈاکٹر وھبہ زحیلی لکھتے ہیں:

''جب ہم دنیا کی دارالاسلام اور دارالکفر میں تقسیم کے کلاسیکی نظریہ پر نظر ڈالتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اسلام مختلف قانونی نظام اور اقتدارِاعلیٰ رکھنے والے ممالک اور ریاستوں کے وجود کو تسلیم نہیں کرتا۔ یہ بات اس حد تک درست ہے کہ ان ریاستوں کے مختلف قانونی اور فکری نظام اسلام کی نگاہ میں کوئی اہمیت نہیں رکھتے کیونکہ یہ سب اسلام کے مخالف نظام ہائے فکر ہیں۔ ان کا وجود و عدم اسلام کی نگاہ میں برابر ہے۔ نظری طور پر اسلام انہیں تسلیم نہیں کرتا کیونکہ وہ دین حق ہے اور آخری شریعت ہے جبکہ یہ نظام اس کے نظریے سے متصادم ہیں۔ قرآن حکیم کہتا ہے: ''وہی ہے جس نے اپنا رسول ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا تاکہ اسے تمام ادیان پر غالب کرے، چاہے یہ مشرکین کو ناگوار ہی کیوں نہ لگے''۔ تاہم امر واقع کے طور پر اسلام اس دنیا میں مختلف ریاستوں کے وجود کا مخالف نہیں ہے۔ اپنے نظریے اور نظام فکر کے حوالے سے مسلمانوں کی ذمہ داری محض اتنی ہے کہ وہ اسلام کے پیغام کو دوسروں تک پہنچائیں۔ نبی اکرم ﷺ اپنے رب کی طرف سے نازل کردہ ہدایت کو دوسروں تک پہنچانے پر مامور تھے۔ نبی اکرم ﷺ کے بعد ان کی اُمت کی بھی یہی ذمہ داری ہے کہ وہ اس مشن کو جاری رکھے''[۱۶]۔

ڈاکٹر وھبہ زحیلی اس گفتگو سے یہ بات ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ انسانیت تک خدا کا پیغام پہنچانا مسلمانوں کی ذمہ داری ہے تاہم اس فریضہ کا منطقی نتیجہ یہ قطعی نہیں ہے کہ دوسری ریاستوں کے وجود اور ان کے پرامن حق بقا کو تسلیم نہ کیا جائے۔ ڈاکٹر وھبہ زحیلی کے خیال میں قرآن کی آیت: ''أن تكون أمة هي أربىٰ من أمة'' میں غیر مسلم ریاستوں اور مختلف فکری و قانونی نظاموں کے حق بقا کا مفہوم ملتا ہے[۱۷]۔

جدید مسلمان علماء و مفکرین نے ڈاکٹر محمد حمیداللہ کے نظریۂ پرامن بقائے باہمی کو آگے بڑھاتے

ہوئے اس سوال پر بھی بحث کی ہے کہ مسلمان اور غیر مسلم کے تعلقات کے باب میں کیا اصل حالت جنگ ہے یا امن۔ ان علماء و مفکرین نے اس سوال کا جواب یہ دیا ہے کہ اصل حالت امن ہے، جنگ محض ایک عارضی کیفیت ہے۔ ایک ریاست دارالحرب محض اسی وقت بنتی ہے جب عملاً اس کی دارالاسلام کے ساتھ جنگ چھڑ جائے۔ یہ کسی مستقل حالت و کیفیت کا نام نہیں۔

بیسویں صدی کے جن ممتاز مسلمان مفکرین و اہل قلم نے ڈاکٹر محمد حمیداللہ کے اتباع میں اپنی تحریروں میں پرامن بقائے باہمی کے تصور کو اجاگر کیا ہے ان میں ڈاکٹر وھبہ زحیلی، علامہ ابوزہرہ، علامہ عبدالوہاب خلاف، ڈاکٹر سعید رمضان بوطی، ڈاکٹر عبدالکریم زیدان، محمد علی حسن، ڈاکٹر عبدالحمید ابوسلیمان جیسے نامور علماء و مفکرین شامل ہیں[۱۸]۔

۳۔ تصورِ جنگ

ڈاکٹر محمد حمیداللہ نے اپنی تحریروں میں اسلامی ریاست کے غیر مسلم دنیا کے ساتھ حالت جنگ میں تعلقات کا بھی تفصیل سے جائزہ لیا ہے۔ انہوں نے اس سوال پر بھی بحث کی ہے کہ اسلام میں جنگ اور جہاد کے مقاصد کیا ہیں؟ جنگ کی جائز صورتیں کون سی ہیں؟ جنگ کے دوران دشمن کے ساتھ اسلامی لشکر کا برتاؤ کیا ہوگا؟ اسلام میں جنگی قیدیوں کے حقوق کیا ہیں؟ جنگی حیثیت کا خاتمہ کب ہوتا ہے؟

ڈاکٹر محمد حمیداللہ اسلام میں جنگ کو پانچ اقسام میں تقسیم کرتے ہیں۔ یہ اقسام ان مختلف النوع مقاصد و اہداف کو ظاہر کرتی ہیں جن کے حصول کے لیے اسلام میں جنگ کی اجازت دی گئی ہے[۱۹]۔

ا۔ سابقہ جنگ کا تسلسل

اس کا مفہوم یہ ہے کہ ایک جنگ جو پہلے سے جاری آ رہی تھی اگر وہ عارضی طور پر بند ہو گئی ہو، تو اسے دوبارہ شروع کیا جا سکتا ہے۔ ایسی جنگ شرعاً جائز ہے، کیونکہ یہ سابقہ حالت جنگ کے تسلسل میں ہے۔ درمیانی وقفہ امن سے حربی ریاست کی حربی حیثیت ختم نہیں ہو جاتی۔

۲۔ مدافعانہ جنگ (Defensive War)

اسلام میں جنگ کی ایک اور جائز صورت دفاع کی جنگ ہے۔ مدافعانہ جنگ اس وقت لڑی جاتی ہے جب کفار مسلمانوں کے خلاف جارحیت کریں اور دارالاسلام پر چڑھ دوڑیں۔ اس وقت

مسلمانوں کا یہ حق ہے کہ وہ اپنی زمین، قوم اور اپنے نظام کا دفاع کریں۔

۳۔ متعاطفانہ اور ہمدردانہ جنگ (Sympathetic War)

اس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر کسی ملک میں مسلم اقلیت آباد ہے، جس پر مظالم کئے جا رہے ہیں اور اسلامی ریاست کا اس ملک کے ساتھ کوئی باقاعدہ معاہدہ امن و دوستی نہیں ہے کہ جنگ کرنے سے اس معاہدے کی خلاف ورزی ہوتی ہو تو ایسی صورت میں اس مسلم اقلیت کے تحفظ کے لیے اسلامی ریاست جنگ کر سکتی ہے[۲۰]۔

۴۔ تعزیری یا معاقبانہ جنگ (Punitive War)

اگر ریاست کے اندر کوئی گروہ جائز حکومت وقت کے خلاف بغاوت کرے اور داخلی امن و امان کو تباہ کرنے کی کوشش کرے تو اس بغاوت اور فتنے کو مٹانے کے لیے اسلامی ریاست جنگ کر سکتی ہے۔ اس کی مثال مرتدوں اور مانعین زکاۃ کے خلاف حضرت ابوبکرؓ کی جنگ ہے۔

۵۔ دینی مصالح کی تکمیل کی جنگ (Idealistic War)

اسلام کے پیغام کی نشرواشاعت اور دنیا میں دین کا قیام مسلمانوں کا اجتماعی فریضہ ہے۔ اگر کسی غیرمسلم ریاست کی طرف سے دعوت دین کے اس کام میں رکاوٹ ڈالی جائے، تو اس رکاوٹ کو دور کرنے کے لیے جنگ کی جا سکتی ہے۔ دینی مصالح کی تکمیل کے مفہوم میں یہ بات بھی شامل ہے کہ اسلامی ریاست اس امر کو یقینی بنائے کہ غیرمسلم ریاست اپنے مسلم باشندوں کو ان کے دین سے منحرف کرنے کی کوشش نہیں کرتی۔

دینی مصالح اور دعوتِ اسلامی کے تحفظ کے اس تصور سے یہ مفہوم ضمناً اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اگر کوئی ریاست دعوت اسلامی کی راہ میں رکاوٹیں نہیں ڈالتی۔ مسلمان باشندوں کو ترغیب و ترھیب کے مختلف ہتھکنڈوں سے ان کے دین سے ہٹانے کی کوشش نہیں کرتی اور مسلمان مبلغین کو اپنی زمین پر آزادانہ تبلیغ کی اجازت دیتی ہے تو ایسی ریاست کے خلاف قتال جائز نہیں۔

ڈاکٹر محمد حمیداللہ کے نزدیک اس امر کے باوصف کہ اسلام دنیا میں حکومت الٰہیہ کا قیام چاہتا ہے، دنیا میں کفر کے خاتمے کا وسیلہ جہاد و قتال نہیں بلکہ دعوت و تبلیغ، وعظ و ارشاد اور منطق و دلیل ہے۔ اسلام میں کسی فرد کو اپنے ضمیر کی آواز کے خلاف اسلامی دین و عقیدہ قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی ریاست نہ صرف اپنی زمین پر غیرمسلموں کا وجود برداشت کرتی

ہے بلکہ انہیں اپنے عقیدے اور نظریے کی آزادی بھی عطا کرتی ہے۔

ڈاکٹر محمد حمیداللہ نے جنگ میں شریک افراد اور عام شہریوں کے ساتھ برتاؤ کے حوالے سے شریعت کا موقف بہت مدلل انداز میں بیان کیا ہے اور واضح کیا ہے کہ اسلامی قانون میں عام شہری یا غیر محاربین معصوم الدم ہیں۔ جنگ میں ان کی جانوں اور املاک کو نقصان نہیں پہنچایا جا سکتا[۲۱]۔

جنگی قیدیوں کے حوالے سے ان کی رائے یہ ہے کہ انہیں قتل نہیں کیا جائے گا۔ اس سلسلے میں انہوں نے ابن رشد کا قول نقل کیا ہے کہ صحابہ کرامؓ کے دور میں اس امر پر اجماع ہو گیا تھا کہ جنگی قیدیوں کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ ان کے خیال میں دشمن کے جنگی قیدیوں کو رہا کرنا ایک پسندیدہ فعل ہے۔ تاہم یہ حکومت کی صوابدید ہے کہ وہ چاہے تو انہیں رہا کر دے یا قید میں رکھے۔

ڈاکٹر محمد حمیداللہ کے تصور جنگ و جہاد نے بین الاقوامی تعلقات کے میدان میں جدید مسلم فکر پر گہرے اثرات ڈالے ہیں۔ بیسویں صدی کے بیشتر مسلمان مفکرین اور دانشوروں نے اس فکر کو اپنایا ہے اور مذکورہ تصور جہاد کو آگے بڑھایا ہے۔ ان مفکرین کی رائے میں دعوت دین کو پھیلانے کا ذریعہ وعظ اور تبلیغ و ارشاد ہے۔ قتال صرف اسلامی مملکت کے دفاع یا دعوت دین کے تحفظ کے لیے جائز ہے۔ اس کی ضرورت اس وقت پیش آتی ہے جب غیر مسلم حکومت مسلمانوں کو جبر و قوت سے عقیدہ اسلام سے ہٹانے کی کوشش کرے، مسلمان مبلغین کے فریضہ دعوتِ دین میں رکاوٹیں ڈالے۔

ڈاکٹر وھبہ زحیلی کے خیال میں نبی اکرمﷺ کے تمام غزوات دفع ظلم و تعدی کے لیے تھے۔ ان کی رائے میں اسلام میں جہاد کے تین مقاصد ہیں:

۱۔ کفار کی طرف سے جارحیت کی صورت میں دارالاسلام کا دفاع اور وہاں کے مسلمانوں کی جان و مال کا تحفظ۔
۲۔ آزادی عقیدہ کی حفاظت، دعوت دین کے فروغ کا راستہ ہموار کرنا اور کفار کی طرف سے مسلمانوں کو اپنے عقیدے سے ہٹانے کی کوششوں کی مزاحمت۔
۳۔ مظلوم مسلمانوں کی اعانت و دستگیری[۲۲]۔

ڈاکٹر سعید رمضان بوطی کا موقف یہ ہے کہ قرآن میں قتال کی جتنی بھی آیات آئی ہیں، وہ ظلم و تعدی کے سیاق میں آئی ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قتال صرف اسی صورت میں جائز ہے جب دشمن کی طرف سے بالفعل جارحیت کا ارتکاب ہو یا جارحیت کا قصد ظاہر ہو[۲۳]۔

علامہ رشید رضا کی رائے میں اسلام کے پرچار کے لیے جنگ کرنے اور اسلام کے دفاع کے

لیے جنگ کرنے میں فرق ہے۔ موخرالذکر صورت تو ہمیشہ قانونی و اخلاقی دائرہ کار میں آتی ہے جب کہ اوّل الذکر نوعیت کی جنگ اسی صورت میں قانونی ہے جب اسلام کی دعوت کے پرامن ذرائع مسدود ہوں یا مسلمانوں کو اپنے عقائد کے مطابق زندگی بسر کرنے میں تنگی محسوس ہو۔ نیز اہلِ کتاب کو مسلمان ہونے پر مجبور کرنا اس لیے غیر شرعی اقدام ہوگا کہ اس سے قرآن کے اس مسلمہ اصول کہ ''دین میں جبر نہیں'' کی نفی ہوتی ہے۔

اسی طرح کے خیالات کا اظہار علامہ ابوزہرہ، عبدالوہاب خلاف، مولانا وحیدالدین خان اور ڈاکٹر عبدالحمید سلیمان نے بھی کیا ہے۔

۴۔ اسلامی قانون کا علاقائی دائرہ اختصاص (Jurisdiction)

پروفیسر مجید خدوری نے اپنی کتاب ''اسلام کا قانون بین الاقوام'' میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ دنیا کے باقی قوانین کے برعکس اسلامی قانون کا دائرہ اختصاص اور اس کے علاقائی حدود عمل (Territorillity of law) متعین نہیں ہے۔ یہ ایک شخصی قانون ہے جو دنیا کے ہر خطے میں رہنے والے مسلمان پر لاگو ہوتا ہے[۲۴]۔

ڈاکٹر محمد حمیداللہ نے بہت مدلل انداز میں اس اشکال کا جواب دیا ہے اور واضح کیا ہے کہ اسلامی قانون جہاں ایک شخصی قانون ہے وہاں یہ ایک متعین علاقائی دائرہ اختصاص بھی رکھتا ہے۔ اسلامی قانون اور اسلامی ریاست متعین جغرافیائی حدود میں کام کرتے ہیں[۲۵]۔ اسلامی ریاست کا اقتدارِ اعلیٰ اور حدود عمل اس کی حدود اراضی تک محدود ہیں۔

ایک اسلامی ریاست اپنی فوجداری و تعزیری قوانین صرف انہی لوگوں پرنافذ کرسکتی ہے جو اس کے اپنے حدود عمل میں رہتے ہیں۔ اس کی عدالتوں کا دائرہ سماعت اس کی اپنی ارضی حدود تک محدود ہے۔ اسلامی ریاست صرف انہی اموال و اعراض اور نفوس کی حفاظت کی ذمہ دار ہے جو اس کے حدود اختیار یا علاقہ مقبوضہ میں ہوں۔ ان حدود کے باہر کسی چیز کی حفاظت کی ذمہ دار نہیں۔ ڈاکٹر محمد حمیداللہ کے خیال میں صرف دارالکفر سے دارالاسلام کی طرف ہجرت کرنے والا مسلمان ہی اسلامی ریاست کا شہری ہے اور ریاست کی طرف سے ملنے والے حقوق کا مستحق ہے[۲۶]۔

ریاست کے حدود عمل کا متعین حدود ارضی تک ہونے کا جو تصور ڈاکٹر محمد حمیداللہ نے پیش کیا ہے، وہ درحقیقت معاصر سیاسی فکر یعنی علاقائی اقتدارِ اعلیٰ (Territorial Sovereignty) کی ایک

بازگشت ہے۔ اس سے اسلامی ریاست ان الجھنوں اور اشکالات سے بچ جاتی ہے، جو اسلامی ریاست کے ماوراء الحدود قرار دینے سے پیدا ہوتی ہیں۔

ڈاکٹر محمد حمیداللہ نے غیر مسلم ریاست کے مسلمان باشندے کی دینی ذمہ داری اور اس کی فوجداری مسؤولیّت کے درمیان فرق کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ غیر مسلم ریاست کا مسلمان تمام اسلامی احکام، اوامر و نواہی کا پابند ہے۔ یہ اس کی دینی ذمہ داری ہے۔ تاہم جہاں تک اس کے ان جرائم کا تعلق ہے جن کا ارتکاب وہ غیر مسلم ریاست کی سرزمین پر کرتا ہے، ان کے لیے وہ اسلامی عدالت میں جوابدہ نہیں۔ اسی طرح اسلامی عدالت، اسلامی ریاست کے اس مسلمان شہری کے فعل کی بھی سماعت نہیں کرے گی جو اس نے اسلامی ریاست کی حدود سے باہر کیا ہو۔ اگر اس نے غیر مسلم ریاست میں کسی کا مال ضائع کیا تو اسلامی عدالت مال کے مالک کو اس نقصان کا تاوان دلانے کی پابند نہیں ہے، کیونکہ جرم کا ارتکاب اسلامی ریاست کے حدودِ عمل سے باہر ہوا ہے۔ تاہم دینی اعتبار سے ایسا شخص گناہ گار ہے اور خدا کے سامنے اپنے عمل کا جوابدہ ہے۔

ڈاکٹر محمد حمیداللہ کے مذکورہ موقف کی بنیاد حنفی فقہ کی وہ نصوص ہیں جن کی رو سے دارالاسلام کی حدود سے باہر کیے گئے جرائم کو اسلامی ریاست میں قابل سماعت قرار نہیں دیا گیا[۲۷]۔ تاہم اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا غلط ہوگا کہ دارالحرب میں واقع ہونے والے ناجائز فعل جیسے چوری، غصب مال، اکل ربا وغیرہ کو فقہ حنفی ناجائز فعل قرار نہیں دیتی۔ ڈاکٹر محمد حمیداللہ نے اس اشکال کو امام ابویوسفؒ کے اس قول سے رفع کیا ہے کہ ''مسلمان ہر جگہ احکام شرع کا پابند ہے''[۲۸]۔ اس طرح ڈاکٹر محمد حمیداللہ نے فقہ حنفی کے حوالے سے بعض معروف مغالطوں کی بھی تردید کی ہے۔

۵۔ اسلامی ریاست کی غیر مسلم اقلیت

ڈاکٹر محمد حمیداللہ نے اسلامی ریاست کی غیر مسلم اقلیت۔ ذمیوں کے حوالے سے پائی جانے والی الجھنوں اور غلط فہمیوں کو اپنے خصوصی مطالعے کا موضوع بنایا ہے۔ ذمّیوں سے مراد وہ غیر مسلم ہیں جن کے تحفظ اور بقاء کی ذمہ داری اسلامی ریاست نے اپنے ذمے لی ہو۔

بیسویں صدی کی مغربی فکر میں ذمیوں کے حوالے سے بہت سے مغالطے اور غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔ کئی مغربی مصنفین کے نزدیک ذمی اسلامی ریاست کے دوسرے درجے کے شہری ہیں جو متعدد سیاسی حقوق اور آزادیوں سے محروم ہوتے ہیں۔ جزیے کو بھی ان اہل قلم کی تحریروں میں بہت زیادہ بدنام کیا گیا ہے۔ وہ اسے کفر کی سزا قرار دیتے ہیں۔ ان کے مصنفین کے نزدیک عقد ذمہ اپنے اندر

ذمیوں اور غیر مسلم باشندوں کی تذلیل کا عنصر لیے ہوئے ہے۔ ان کی رائے میں معاہدہ ذمہ کا مقصد استعماری نظام کا قیام اور فاتح معاشرے کی برتری کی حفاظت ہے(۲۹)۔

اسلام کے تصور ذمہ پر بیسویں صدی کے کئی مسلمان علماء و مفکرین نے قلم اٹھایا ہے اور ذمیّوں کے حوالے سے پائی جانے والی غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کی ہے۔ ڈاکٹر محمد حمیداللہ مسلمان مفکرین اور اہل قلم کے اس ہراول دستے میں شامل ہیں جنہوں نے اس موضوع کو اپنے مطالعے کے لیے منتخب کیا اور دادِ تحقیق دی۔

ڈاکٹر محمد حمیداللہ ذمیوں کو اسلامی ریاست کا مکمل شہری قرار دیتے ہیں۔ شہری حقوق میں وہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان کسی امتیاز کے قائل نہیں۔ جزیہ کو وہ تحفظ ٹیکس (Protection Tax) قرار دیتے ہیں۔ یہ ٹیکس اس تحفظ کے بدلے میں ہے جو اسلامی ریاست انہیں فراہم کرتی ہے۔ تاہم اگر اسلامی ریاست کسی بناء پر انہیں تحفظ فراہم کرنے میں ناکام رہے تو وہ ان سے جزیہ وصول کرنے کا حق نہیں رکھتی۔ اسی طرح اگر ذمی اسلامی ریاست کے دفاع میں شرکت پر آمادہ ہوں تو ان سے جزیہ وصول نہیں کیا جائے گا۔

ڈاکٹر صاحب کے خیال میں حقوق و ذمہ داریوں کے اعتبار سے ذمیوں کی حیثیت اسلامی ریاست میں مسلمانوں کے مقابلے میں کئی لحاظ سے بہت بہتر ہے(۳۰)۔ مثلاً وہ ریاست کے دفاع اور عسکری خدمت کے پابند نہیں جبکہ مسلمان شہری اس کا پابند ہے۔ اسلامی ریاست غیر مسلم کا جزیہ معاف کر سکتی ہے لیکن زکاۃ کسی بھی صورت معاف نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ ایک مذہبی فریضہ ہے جبکہ جزیہ ریاست اور غیر مسلم باشندے کے درمیان معاہدے کا حصہ ہے۔ جزیہ صرف مردوں پر واجب ہے جو جنگی خدمات انجام دے سکتے ہوں، عورتوں پر نہیں، جبکہ زکاۃ ہر صاحب نصاب پر واجب ہے۔ اس میں مرد و عورت کی تخصیص نہیں۔

ڈاکٹر محمد حمیداللہ کے نزدیک ذمیوں کو نہ صرف یہ کہ اسلامی ریاست میں اپنے عقائد اور مذہبی رسوم کی آزادی حاصل ہوتی ہے بلکہ انہیں یہ حق بھی حاصل ہوتا ہے کہ وہ اپنے ہی قانون اور ججوں کے ذریعے اپنے مقدمات کا فیصلہ کرائیں۔ اس کی اجازت ان کی رائے میں سورہ مائدہ کی آیت ۴۷ "ولیحکم أھل الانجیل بما أنزل اللہ فیہ" (اہل انجیل اس چیز کے مطابق فیصلہ دیں جو اللہ تعالیٰ نے انجیل میں نازل کی ہے) سے ثابت ہوتی ہے۔ ان احکام کے تحت عہد نبوی ﷺ میں قومی خود مختاری ساری آبادی کے ہر ہر گروہ کو مل گئی تھی۔ جس طرح مسلمان اپنے دین، عبادات، قومی معاملات اور

دیگر امور میں مکمل طور پر آزاد تھے، اسی طرح دوسری ملت کے لوگوں کو بھی کامل آزادی تھی(۳۱)۔ اس سے یہ مفہوم اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کو اپنی عدالتیں قائم کرنے اور اپنے قانونی معاملات نبٹانے کی آزادی حاصل ہوتی ہے۔

ڈاکٹر محمد حمیداللہ کی رائے میں پالیسی سازی کے مناصب کو چھوڑ کر باقی تمام اہم مناصب پر غیر مسلم باشندوں کی تقرری ہو سکتی ہے۔ سربراہ مملکت انہیں اپنا وزیر یا اعلیٰ انتظامی کونسل کا رکن بنا سکتا ہے(۳۲)۔

ڈاکٹر محمد حمیداللہ کا کہنا ہے کہ مدینہ کی ریاست میں یہودی قبائل نے اپنی آزادانہ مرضی سے نبی اکرم ﷺ کو سربراہ مملکت مانا تھا۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ غیر مسلم شہری سربراہ مملکت کے انتخاب اور ریاست کی سیاسی زندگی میں شرکت کا مکمل حق رکھتے ہیں(۳۳)۔

میثاق مدینہ کی رو سے مسلمانوں اور یہودیوں کی ایک مشترکہ مشاورتی کمیٹی تشکیل دی گئی تھی جس کا مقصد دفاع اور ریاست کے انتظامی امور پر مشاورت کرنا تھا۔ ڈاکٹر محمد حمیداللہ کی رائے میں یہ امر بھی غیر مسلموں کے سیاسی حقوق کی نشاندہی کرتا ہے۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ڈاکٹر محمد حمیداللہ کی طرح عالم اسلام کے کئی دیگر ممتاز مفکرین نے بھی انہی خطوط پر اپنی فکر کو آگے بڑھایا ہے اور اسلامی ریاست میں ذمیوں کے حقوق اور آزادیوں پر گفتگو کی ہے۔ ان مفکرین میں نمایاں حیثیت کے حامل ڈاکٹر وھبہ زحیلی، ڈاکٹر عبدالکریم زیدان، ڈاکٹر سعید رمضان بوطی شامل ہیں۔

۶۔ غیرجانبداری کا اصول

جدید بین الاقوامی قانون کا ایک اہم تصور، غیر جانبداری کا اصول ہے۔ غیر جانبداری کے معنی یہ ہیں کہ کسی جاری جنگ میں کوئی مملکت حصہ نہ لے اور جنگ کے ہر دو فریقوں سے مسالمانہ تعلقات برقرار رکھے(۳۴)۔

فنی نقطہ نظر سے غیرجانبداری کسی ریاست کا ایک مخصوص طرزعمل ہے جو وہ دو متحارب ریاستوں کے درمیان جنگ سے الگ تھلگ رہ کر اختیار کرتی ہے۔ اس طرزعمل سے متحارب اور غیرجانبدار ریاستوں کے درمیان کچھ حقوق اور ذمہ داریاں وجود میں آتی ہیں جن کا احترام سب ریاستوں کو کرنا ہوتا ہے(۳۵)۔

مستشرقین اور مغربی مصنفین نے تصور غیر جانبداری کے حوالے سے بھی اسلام پر تنقید کی ہے۔ ان مصنفین کا کہنا ہے کہ اسلامی قانون غیرجانبداری کے تصور سے ناآشنا ہے۔ وہ دنیا کو دارالاسلام اور دارالحرب جیسے دو متحارب بلاکوں میں تقسیم کرتا ہے، ان کے درمیان وہ کسی ایسے بلاک کے وجود کا قائل نہیں جو ان سے الگ تھلگ ہو۔

ڈاکٹر محمد حمیداللہ جدید مسلمان مفکرین میں غالبًا وہ پہلے فرد ہیں جنہوں نے اسلام میں تصور جانبداری کو اپنے مطالعے کا موضوع بنایا ہے۔ انہوں نے قرآنی آیات و احادیث اور قدیم فقہی لٹریچر کی نصوص سے یہ ثابت کیا ہے کہ اسلام غیر جانبدار ریاستوں کے وجود کو تسلیم کرتا ہے۔

بین الاقوامی تعلقات کی رو سے اسلام غیر مسلموں کو دو زمروں میں تقسیم کرتا ہے، مخالفین و غیر مخالفین، مخالفین وہ غیر مسلم ہیں جنہوں نے مسلمانوں اور اسلامی ریاست کے خلاف جارحیت کا ارتکاب کیا ہو، مسلمانوں کی زمین، اموال اور حرمتوں کے ساتھ تعرض کیا ہو یا دعوت دین کی راہ میں رکاوٹیں ڈالی ہوں۔ غیر مخالفین وہ غیر مسلم ہیں جنہوں نے اسلامی ریاست اور مسلمانوں کے خلاف کوئی جارحیت نہ کی ہو اور نہ جنگی معاملے میں مسلمانوں کے کسی دشمن کا ساتھ دیا ہو۔ ایسے غیر مسلم افراد اور ریاستیں اسلام کی نگاہ میں غیرجانبدار ریاستیں ہیں جن کی غیر جانبداری کا احترام کیا جائے گا۔

اس سلسلے میں شیخ ابوزہرہ لکھتے ہیں: ''قرآن کا مفروضہ ہے کہ مسلمانوں کی کفار کے ساتھ جنگ کی صورت میں ایسی اقوام ضرور ہوں گی جو اس جنگ میں کسی فریق کا بھی ساتھی بننا نہ چاہیں گی۔ قرآن کی رُو سے ایسی اقوام کی غیر جانبداری کا احترام مسلمانوں پر واجب ہے۔ اس حقیقت کی نشاندہی یہ آیت کرتی ہے: ''-------- سوائے ان لوگوں کے جو کسی ایسی قوم سے جا ملیں جن سے تمہارا معاہدہ ہو--- اگر وہ تم سے ہاتھ کھینچ لیں اور جنگ نہ کریں اور صلح کی خواہش کریں تو ایسی حالت میں اللہ نے تم کو ان پر دست درازی کی کوئی راہ نہیں دی ہے[۳۶]۔ یہ آیت بتاتی ہے کہ جو غیرجانبداری کا خواہش مند ہو، اس کی اس خواہش کا احترام کیا جائے گا اور اس کے اس حق غیر جانبداری کو تسلیم کیا جائے گا[۳۷]۔

مولانا مودودی اور ڈاکٹر وھبہ زحیلی کے نزدیک ایسی تمام اقوام جو مسلمانوں کے امن کا معاہدہ کریں، غیرجانبدار اقوام ہیں[۳۸]۔

اسلامی قانون کی رُو سے اگر کوئی ریاست مسلمانوں کے بارے میں غیرجانبدار رہنا چاہتی ہو تو

وہ تین شرائط کے ساتھ رہ سکتی ہے۔

اوّلاً: وہ مسلمانوں سے جنگ نہ کرے۔

ثانیاً: مسلمانوں کے دشمنوں سے الگ رہے اور مسلمانوں کے ساتھ پرامن تعلقات رکھے۔

ثالثاً: اس انتظام سے اسلام اور کلمۃ اللہ کی سربلندی پر زد نہ پڑے[۳۹]۔

تاریخ اسلامی میں ہمیں متعدد ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ کچھ ریاستیں اسلامی ریاست اور کسی دوسری ریاست کے مابین نزاع میں الگ تھلگ رہیں اور اسلامی ریاست نے ان کی اس حیثیت کا احترام کیا۔ حبشہ، نوبہ اور قبرص کی ریاستیں اس کی مثال ہیں[۴۰]۔

ڈاکٹر محمد حمیداللہ نے امام سرخسی کی ''شرح السیر الکبیر'' سے متعدد ایسی نصوص نقل کی ہیں جن سے غیرجانبدار ریاست کے حقوق نیز حدود غیرجانبداری کا تعین ہوتا ہے، مثال کے طور پر امام سرخسی لکھتے ہیں کہ: ''اگر ایک ریاست سے مسلمانوں نے معاہدہ امن کر رکھا ہے اور اس پر کوئی تیسری ریاست حملہ کرتی ہے اور اس کے آدمیوں کو قیدی بنا لیتی ہے، بعد میں اسلامی ریاست سے بھی اس کی جنگ چھڑ جاتی ہے تو اسلامی ریاست کو یہ حق ہے کہ وہ اپنی معاہد ریاست کے ان افراد کو اپنی قید میں لے لے جو اس حربی ریاست کی قید میں ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلامی ریاست معاہد ریاست کی ایسی جائیداد کی جائز حقدار ہے جو اسلامی ریاست نے کسی تیسری ریاست سے قانونی طریقے سے حاصل کی ہو۔ اس طرز عمل کو معاہد ریاست کی غیرجانبداری کی خلاف ورزی تصور نہیں کیا جائے گا[۴۱]۔

اس مثال سے ڈاکٹر محمد حمیداللہ نے یہ ثابت کیا ہے کہ قدیم فقہاء کے ہاں غیرجانبداری کا تصور موجود تھا اور وہ اس کی حدود سے بھی آشنا تھے۔

حواشی و حوالہ جات

۱۔ مجید خدوری، اسلام کا قانون امن و جنگ (انگریزی)، جون ہوب کنز، ۱۹۵۵ء، ص ۵۵

۲۔ مجید خدوری، اسلام کا قانون امن و جنگ (انگریزی)، تحقیق: کتاب السیر، از محمد بن الحسن الشیبانی، الدارالمتحدۃ للنشر، لبنان، ۱۹۷۵ء، ص ۲۶۔

۳۔ برنارڈ لوئیس، Political Launguege of Islam شکاگو یونیورسٹی، ۱۹۸۸ء، ص ۷۳

۴۔ دیکھیے:

Giles Kepel, *The Revenge of God: The resergence of Islam, Christiniaty and Judaism in the Modern World* (U. park: pa. st. U. press kau) Bruce lawrence, Defenders of God: *The Fundamentalist Revolt against the Modern Age* (U.Y: Harper & Row 1986)} David pryce-janes, *A war with Modernity: Islam's challenge to the West* (London: Alliance publication for the Institute of European Defence and Strategic Studies 1992). Emmanvel sivan, *Radical Islam: Medieval Theology and Modern Politics* (New Haven: Yale University press, 1990).

۵۔ ڈاکٹر محمد حمیداللہ، سیر یا قانون بین الممالک، فکرونظر، جلد ۵، ص ۸۰۹۔ Muslim Conduct of State, ص ۷۱

۶۔ دیکھئے:

Chamber's Encyclopeadia, Political Theory The Aristotelion Theory, vol. 11. p.60; Aristotle, politics, Book 1, ch.7

۷۔ دیکھئے: ڈاکٹر محمد حمیداللہ، مقدمہ احکام اهل الذمہ از علامہ ابن القیم، لبنان، دارالعلم للملایین، طبع اوّل، ۱۹۸۲ء، ص ۸۲

۸۔ دیکھیے: اشارک، Introduiction to International law ، لندن، بٹر ورتھ، ۱۹۸۴ء، ص ۱۷-۲۱

۹۔ ڈاکٹر محمد حمیداللہ، Muslim Conduct of State، ص ۱۷

۱۰۔ وھبہ زحیلی العلاقات الدولیة، ص ۱۰۳، ۱۰۴

۱۱۔ دیکھئے: ایل۔ این۔ ٹینڈن، International، لاہور، منصور بک ہاؤس، ۱۹۸۰ء، ص ص ۱۳۱-۱۳۴

۱۲۔ ڈاکٹر محمد حمیداللہ، Muslim Conduct of State: Peace Islamic Culture, vol. XV, 1941, p.160.

۱۳۔ دیکھئے: سورۃ الممتحنہ: آیت ۸

۱۴۔ دیکھئے: آیات ۱۷۷:۲، ۴:۹۰، ۵:۱، ۸:۷۲

۱۵۔ دیکھئے: آیات ۱۲۸:۷۷، ۳:۳۶

۱۶۔ وھبہ زحیلی، العلاقات الدولیه فی الاسلام، بیروت، موسسة الرسالة، ۱۹۸۱ء، ص ص ۱۰۳، ۱۰۴

۱۷۔ مصدر بالا، ص ۱۰۴

۱۸۔ ابوزہرہ، العلاقات الدولیۃ فی الاسلام، ص ۵۰؛ عبدالوہاب خلاف، السیاسۃ الشرعیۃ فی الشؤون الدستوریۃ والخارجیۃ والمالیۃ دارالعلم للنشر و التوزیع، کویت ۱۹۸۸ء، ص ۸۴۔

۱۹۔ ڈاکٹر محمد حمیداللہ Muslim Conduct of State، ص ۱۶۵-۱۷۰

۲۰۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ جدید بین الاقوامی قانون بھی انسانی بنیادوں پر جنگ کا حق دیتا ہے۔ دیکھئے: من سینانووک:

Humanitarian Intervention in International and Islamic law, *American Jaurnal of Islamic Social Sciences*, vol. 20, 2003, pp. 88-106, Fernando R. Tesou, *Humanitarian Intervention: An Enquiry into law and Morality*, Dobbs Ferry, Ny, Transnational Publishers, 1988, p.6.

۲۱۔ Muslim Conduct of State، ص ۲۰۵

۲۲۔ وھبہ زحیلی، العلاقات الدولیہ فی الاسلام، ۳۰-۳۲

۲۳۔ بوطی، سعید رمضان، الجہاد فی الاسلام، ص ۱۰۶-۱۰۸

۲۴۔ Khudduri, Islamic law of nation, Baltimore, 1966, p.7

۲۵۔ Dr Mohammed Hamidullah, A review of the Professor Majid Khudduri's Islamic Law of Nations, *The Islamic Rewiew*, July-August 1966.

۲۶۔ ڈاکٹر محمد حمیداللہ Muslim Conduct of State,

۲۷۔ دیکھیے: سرخسی، شرح السیرالکبیر، جلد۳، ص ۲۲۳

۲۸۔ کاسانی، بدائع الصنائع، جلد۷، ص ۱۳-۱۳۴

۲۹۔ ان آراء کے لیے دیکھئے: مجید خدوری

International law: Treadion in law in the Middle East, p. 362, 363; A.S Triton, *Islam: Blief and practice*, ed. E.O James, London, Hotchinson's University Library, 1954; S.D. Goitein, Jews and Arabs: *Their Contracts through the Ages* (New York) schocken books, 1955, Bat ye, or, The Dimmis: The muslim *Jews and christiens under Islam*،

۳۰۔ ڈاکٹر محمد حمیداللہ، Muslim Conduct of State ، ص ۱۱۲

۳۱۔ ڈاکٹر محمد حمیداللہ، خطبات بہاولپور، ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد، ص ۳۷۱

۳۲۔ Foreword to Introdroduction to Islam, Publications of centre Islamique, Hyder Abad press, 1957, p. 139

۳۳۔ Introduction to Islam, p. 136

۳۴۔ ڈاکٹر محمد حمیداللہ، قانون بین الممالک کے اصول اور نظیریں۔ مکتبہ ابراھیمیہ حیدرآباد دکن، ۱۳۶۴ھ، ص ۱۹۳

۳۵۔ دیکھیے: اوپن ہائم، International law، جلد۲، طبع ہفتم، ص ۶۵۳

۳۶۔ سورۃ النساء: آیت ۹

۳۷۔ ابوزہرہ، العلاقات الدولیۃ فی الاسلام، دارالفکر العربی، مصر، ص ۵۱

۳۸۔ مولانا مودودی، الجہاد فی الاسلام، لاہور، ادارہ ترجمان القرآن، ۱۹۸۸ء، ص ۲۴۴، وھبہ الزحیلی، العلاقات الدولیۃ فی الاسلام، ص ۱۸۳۔

۳۹۔ دیکھیے: محمود غازی، خطبات بہاولپور، ص ۲۹۴

۴۰۔ وھبہ زحیلی، آثار الحرب فی الفقہ الاسلامی، ص ۲۰۸

۴۱۔ سرخسی، شرح السیر الکبیر، جلد ۴، ص ۱۳۴-۱۳۵